© rasailojaraid.com

علامہ طالوت مرحوم

حضرت امیر شریعت

بطل حریت، زعیم ختم نبوت، خطیب الامت، امیر شریعت مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاری جیسی شخصیت پر جامع مضمون لکھنا میرے جیسے کج مج بیان، ہیچمداں آدمی کا کام نہیں یہ درست کہ ہند و پاکستان کے کروڑوں انسانوں کی طرح مجھے بھی ان سے عقیدت رہی اور ہے۔ مگر ہر عقیدت مند اس کا اہل نہیں کہ وہ ایسی جامع الصفات شخصیت پر ہر پہلو سے اظہار خیال کر سکے اور نہ ایک طویل یا مختصر مضمون میں صحیح طور پر اظہار خیال کیا جاسکتا ہے۔

سفینہ چاہیئے اس بحر بیکراں کے لئے

شاہ جی اپنے وقت کے بہت بڑے سیاسی لیڈر تھے اور اتنے بڑے کہ ابوالکلام، محمد علی جوہر اور ظفر علی جیسے اشخاص (جن کے سامنے گاندھی ایسے لوگ سر جھکاتے تھے) ان سے خم کھاتے تھے شاہ جی اپنے وقت کے بہت بڑے عالم اور دینی بصیرت رکھنے والے مبلغ اسلام تھے اور اتنے بڑے کہ محدث العصر حضرت العلام مولانا سید محمد انور شاہ صاحب کشمیری قدس سرہ العزیز نے انہیں امیر شریعت کا خطاب دے کر خود ان کے ہاتھ پر انگریز کے استیصال کے لئے بیعت میں شرکت فرمائی۔ اور ان کے ساتھ جملہ علماء امت اور قائدین ملت نے بھی اس بیعت میں شرکت فرمائی۔

شاہ جی اپنے وقت کے بہت بڑے خطیب و مقرر تھے اور اتنے بڑے کہ ان سے بعد اور پہلے تقریر کرنا وقت کے انتہائی بڑے خطیبوں کے لئے ناممکن تھا اور بقول مولانا محمد علی جوہر کے "اس ظالم سے نہ پہلے تقریر کی جاسکتی ہے نہ بعد میں، کیونکہ ان کی تقریروں کا رنگ جم ہی نہیں سکتا" اسی وجہ سے حضرت مولانا ابوالکلام آزاد کبھی کسی ایسے جلسے میں تقریر نہیں کرتے تھے، جس میں شاہ جی کو بھی تقریر کرنا ہوتی تھی اور وہ ہمیشہ بہ لطائف الحیل ٹال جایا کرتے تھے۔

شاہ جی اپنے وقت کے بہت بڑے مجاہد تھے اور اتنے بڑے مجاہد جو ہمیشہ ہر جنگ میں صف اول میں نظر آتے ہیں، انھوں نے جتنی تحریکات میں کام کیا خود سب سے آگے رہے۔ اور ہمیشہ سب سے پہلے اپنی جان کا نذرانہ اس تحریک کے لئے پیش کیا یہ الگ بات ہے کہ حضرت سیف اللہ خالد بن ولید کی طرح ان کی موت بھی گھر میں بستر پر آئی۔ اور وہ کسی میدان جنگ میں کام نہ آئے مگر بارہا تختۂ دار تک ہو کر واپس تشریف لائے اور شہادت کی حسرت دل کی دل ہی میں رہی۔

شاعر و سخن سنج

شاہ جی اپنے وقت کے بہت بڑے شاعر اور سخن سنج تھے اور اتنے بڑے کہ ان کے فارسی کلام کی پختگی پر جامی اور نظیری جیسے اساتذہ کے رنگ سخن کا گماں ہوتا ہے اور اردو کے طنزیہ اشعار رنگ اکبر میں ڈوبے ہوئے نظر آتے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہیں اور پھر یہ سب کچھ اس صورت میں ہے کہ اس میدان سے ہمیشہ بے توجہ رہے کبھی کبھی یوں ہی برائے تفنن و تنوع منہ کا مزہ بدلنے کی خاطر کچھ کہہ گزرتے رہے۔ اگر پوری طرح اس طرف توجہ ہوجاتی تو خدا جانے کتنے شعرائے شباب و انقلاب گرد راہ ہوجاتے۔ شاہ جی اپنے وقت کے بہت بڑے سخن فہم و سخن شناس تھے اتنے بڑے کہ شعرائے زمان اپنا کلام ان کی خدمت میں پیش کرکے داد لینے میں اپنی بہت بڑی کامیابی تصور کرتے تھے۔ اور اتنے بڑے کہ موجودہ دور کے بڑے بڑے نقاد پطرس، تاثیر و سالک ادبی مجلس کا انہیں صدر نشین تصور کرتے تھے اور جب بھی موقع میسر آتا ان کے ہاں پہنچ جاتے یا انہیں اپنے ہاں لے جاتے اور پھر یہ ادبی مجلسیں شاہ جی کی بدولت رات رات بھر جاری رہتیں اور صبح ہونے پر یوں محسوس ہوتا کہ

ابھی آئے ابھی گئے

شاہ جی اپنے وقت کی سب سے زیادہ محبوب شخصیت تھے اور اس قدر محبوب کہ لاکھوں کروڑوں آدمی اپنی جانیں ان کے قدموں میں نثار کرنے کو ہر وقت تیار رہتے۔ ایسے جامع الصفات شخص پر مضمون لکھنا آسان کام نہیں اور یہی وجہ ہے کہ اپنی کم مائیگی کے پیش نظر راقم الحروف اب تک خاموش رہا اب بھی ڈرتے ڈرتے "قلم کشائی" کر رہا ہوں۔ اور اس مضمون میں بھی صرف وہ باتیں لکھوں گا جو میرے ذاتی تاثرات کے تحت آئی ہیں شاہ جی کی مکمل شخصیت کے نقوش ابھارنے کی خاطر ایک بہت بڑے جامع الصفات مورخ کا قلم درکار ہے۔

راقم الحروف جب دار العلوم دیوبند میں تعلیم حاصل کر رہا تھا تو ایک دن دورہ حدیث کی کلاس میں ایک پریشاں اور بارعب شخصیت کو دیکھا کہ وہ حضرت حجتہ الاسلام مولانا سید محمد انور شاہ صاحب قدس سرہ کے درس میں طالب علموں کی طرح استفادہ کی خاطر سب سے پیچھے آکر بیٹھ گیا۔ تحقیق کرنے پر معلوم ہوا کہ آپ مولانا حبیب الرحمن لدھیانوی ہیں۔ سب سے پہلے حضرت شاہ جی کا نام راقم الحروف نے انہیں کی زبانی سنا یہ تو یاد نہیں کہ انہوں نے کس سلسلہ میں ان کا ذکر کیا تھا مگر اتنا یاد ہے کہ اس نام میں راقم الحروف نے کچھ کشش ضرور محسوس کی تھی پھر اس کے بعد جب بھی شاہ جی کا نام اخباروں میں نظر سے گزرتا تو راقم شناسایانہ طور پر ادھر متوجہ ہوجاتا۔ اور اس خبر کو ضرور پڑھتا جس میں شاہ جی کی معجز بیانی کا ذکر ہوتا، یا ان کا کوئی بیان درج ہوتا اس طرح وہ خلش جو دل میں پیدا ہوئی تھی بڑھتی رہی تعلیم سے فراغت کے بعد غریب خانہ کی طرف واپسی پر ملتان سے جو گزر ہوا تو برادرم مولانا محمد عبد اللہ صاحب کاتب نے (جو میرے میزبان تھے) مغرب کے قریب فرمایا شاہ جی کی تقریر پر چلو گے؟ انہوں نے کہا "ہاں" میں نے مشتاقانہ کہا ضرور چلوں گا۔ چنانچہ عشاء کے قریب پاک دروازے کے النگ پر ہم جلسہ گاہ میں پہونچے تو کہیں تل دھرنے کو جگہ موجود نہیں تھی۔ عشاء کے بعد شاہ جی کی تقریر شروع ہوئی اور لوگ اس طرح بیٹھے تھے، کان علی رؤسھم الطیور، اس وقت نہ تقریر کا موضوع یاد ہے اور نہ شاہ جی کے وہ نکات یاد ہیں جو انہوں نے اس تقریر میں بیان فرمائے تھے مگر اب بھی جس وقت وہ رات یاد آجاتی ہے تو بلا مبالغہ کانوں میں وہی رس، وہی شیرینی محسوس ہونے لگتی ہے جو اس رات کو راقم نے محسوس کی تھی اور صبح کی اذان اچانک ہونے پر جب وہ تقریر ناتمام شاہ جی نے ختم فرمائی تو جملہ سامعین میں ابھی تشنگی باقی تھی۔ اور سب کی متفقہ رائے یہ تھی کہ تقریر ابھی جاری رہتی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

چاہیئے اور اس کے بعد جب شاہ جی کی عام تقریریں سننے کا اتفاق ہوا تو جملہ تقریروں میں یہی خصوصیت کار فرما دیکھی۔
پھر ایک خصوصیت شاہ جی کی تقریروں کی یہ بھی تھی کہ اس میں دوست، دشمن، موافق، مخالف، اپنے، پرائے، ہندو، مسلم، سکھ، عیسائی سب برابر کے شریک ہوتے تھے۔ اور سبھی محظوظ ہوتے تھے۔ لاہور والوں سے تو اکثر آپ فرماتے تھے کہ تقریر تو آپ میری سنتے ہیں اور ووٹ دوسروں کو دیتے ہیں۔ شاہ جی کی ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ جہاں وہ محسوس کرتے تھے کہ اس جگہ اصلاح کی زیادہ ضرورت ہے یا اس جگہ دوسرے مبلغ بعض وجوہ کی بناء پر جانے سے گھبراتے ہیں، تو وہاں وہ دوبارہ تشریف لے جاتے تھے۔ تاکہ صحیح اسلامی عقائد کی تبلیغ کر کے لوگوں کی اصلاح فرما سکیں چنانچہ ہمارا ضلع (ڈیرہ غازی خان) بھی ایسی ہی جگہوں میں شمار ہوتا تھا۔ پسماندگی، عقائد کی تاریکی، جہالت اور جائے وقوع کی دوری اور ذرائع آمد و رفت کی خرابی کی بناء پر بہت کم لوگ وہاں جاتے تھے۔ اور جو جاتے تھے وہ ان لوگوں کی شدت جہالت سے ناآشنا ہونے کی وجہ سے ایک آدھ سرسری اصلاحی تقریر پر اکتفا کرتے تھے جسے وہ لوگ کچھ سمجھتے، کچھ نہ سمجھتے اور اس طرح وہ تقریر اصلاح کی بجائے فساد کا کام زیادہ کرتی کیونکہ مخالفین بعض اوقات اس کے بعض جملوں کو بگاڑ کر لوگوں کو یہ سمجھا دیتے کہ دیکھئے وہ تو اس طرح کی باتیں کہہ گیا ہے اور کہنے والے کو سال دو سال بھر بعد جب کبھی دوبارہ وہاں آنے کا موقع ملتا تو اسے پتہ چلتا کہ میری باتوں کو کس طرح بگاڑ کر پیش کیا گیا ہے اور وہ اس کے بعد تردید کر پاتا۔ مگر شاہ جی نے ایک آدھ بار ہی وہاں جانے کے بعد ان لوگوں کے مرض کو بھانپ لیا۔ اور ایک تو انہوں نے متواتر آنا شروع کر دیا۔ دوسرے شہروں کے ساتھ ساتھ بستیوں اور دیہات بھی جا جا کر لوگوں کو وعظ و نصیحت سنایا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ کلم الناس علی قدر عقولھم کو مد نظر رکھتے ہوئے انہوں نے ان لوگوں کی زبان سیکھی اور انہیں کی زبان میں انہیں باتیں سمجھانا شروع کیں ایک بار ایک دیہاتی علاقہ (وہوا) میں رسوم کی اصلاح پر تقریر فرما رہے تھے۔ شاید شرک کے معنی سمجھا رہے تھے ایک گھنٹہ کی تقریر کے بعد پوچھا. کیوں بھئی کچھ سمجھے بھی ہو؟ لوگوں نے کہا کچھ بھی نہیں سمجھے دوسرا کوئی مقرر ہوتا تو بدمزہ ہو جاتا اور مزید تقریر کرنے کو اس کا کبھی دل نہ چاہتا مگر شاہ جی نے پورے جوش سے فرمایا کہ میں تو تمہیں سمجھانے آیا ہوں، چنانچہ انہوں نے پہلے سے بھی دوگنے جوش کے ساتھ دوبارہ تقریر شروع کی اور گھنٹہ دو گھنٹہ پھر انہیں شرک کے معنی سمجھائے اور پھر پوچھا کہ اب کچھ سمجھے؟ لوگوں نے پھر نفی میں جواب دیا۔ پھر شاہ صاحب نے تگنے جوش کے ساتھ پھر فرمایا میرا کام تو کوشش کرنا ہے دلوں کی گھنڈیاں تو وہی کھول سکتا ہے اور قرآن پاک کی وہ مشہور آیت تلاوت فرمائی۔ جو موسیٰ علیہ السلام نے فرعون کے پاس جانے سے پہلے تلاوت فرمائی تھی۔

رب اشرح لی صدری و یسر لی امری و احلل عقدۃ من لسانی یفقھوا قولی

اے اللہ میرے سینے کو کھول دے اور میرے کام کو آسان کر دے اور میری زبان کی گرہ کو کھول دے تاکہ یہ لوگ میر بات سمجھ سکیں۔

اور اس کے بعد پھر جوش و خروش کے ساتھ گھنٹے دو گھنٹے اسی مسئلہ پر تقریر فرمائی اور اس شرح و بسط سے کام لیا کہ لوگ اچھی طرح بات کو سمجھ گئے اور آخر میں جب پوچھا کہ اب کچھ سمجھے؟ لوگوں نے اپنی زبان میں کہا "ہاں بینڈا سائیں اب سمجھ گئے ہیں" شاہ جی نے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا۔ جس نے ان کے کام میں سہولت پیدا فرما دی تھی اور

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

فرمایا میں تو تہیہ کرچکا تھا کہ یہ بات آپ کو سمجھا کر ہی جاؤں گا، خواہ مجھے اس سلسلہ میں پچاس بار بھی بولنا پڑے۔ اور خواہ مجھے یہاں اس سلسلہ میں مہینہ بھر بھی رہنا پڑے۔ اپنے ضلع میں ایسی تقریریں سننے کے بعد راقم الحروف اور بھی شاہ جی کا معتقد ہوگیا مگر اس سارے اعتقاد و عقیدت کے بعد بھی مجھے یہ جرأت نہ ہوئی کہ میں شاہ جی سے اپنے آپ کو متعارف کراتا یا تقریر کے علاوہ ان کی خصوصی مجلسوں میں بار بار جاتا۔ مولوی فاضل کا امتحان دینے کے بعد راقم نے سکولوں کی راہ لی اور ملازمت کے سلسلہ میں منٹگمری اور لائل پور کے اضلاع میں مختلف مقامات پر رہا۔ شاہ جی کی تقریر کا جہاں بھی اعلان ہوتا اور وہاں پہونچنے کا امکان ہوتا تو راقم ضرور پہونچ جاتا اور مستفید ہوتا۔ بعد میں شیخ الاسلام والمسلمین علامہ کشمیری کے ایک ادنیٰ ترین شاگرد ہونے کی وجہ سے راقم کو بھی ایک تحریک میں تھوڑا بہت کام کرنے کا موقع میسر ہوا زمیندار اور دوسرے اخباروں میں راقم کے مضامین اور نظمیں پڑھ کر شاہ جی نے اپنے دوستوں سے پوچھنا شروع کیا کہ یہ کون صاحب ہیں؟ برادرم مولانا قاضی احسان احمد صاحب شجاع آبادی کو میرے قلمی نام کے متعلق علم تھا۔ چنانچہ انہوں نے شاہ جی کو سب کچھ بتلادیا جب شاہ جی کو یہ معلوم ہوا کہ مجھے حضرت علامہ کشمیری رحمہ اللہ تعالیٰ سے تلمذ کی برکت بھی حاصل ہوچکی ہے۔ تو انہوں نے ملنے پر اصرار فرمایا۔ راقم لائل پور سے چنیوٹ (ضلع جھنگ) چلا گیا تھا اور مدت کے بعد جب آپ تبلیغ کے سلسلے میں چنیوٹ تشریف لائے تو قاضی صاحب کے ذریعے مجھے آپ کی خدمت میں حاضر ہونے کا موقع ملا۔ اور اس وقت سے آخر دم تک میرے حال پر مہربان رہے۔ اور جب بھی مجھے ان کی خدمت میں جانے کا موقع ملا تو میں نے یہی محسوس کیا کہ پہلے سے زیادہ محبت و عطوفت و رافت و عنایت کی بارش ہورہی ہے۔

چنیوٹ کا معرکہ

چنیوٹ سیٹھوں اور لکھ پتیوں بلکہ کروڑ پتیوں کا شہر ہے۔ اور جب آپ پہلے پہل وہاں تشریف لائے تھے تو سارا چنیوٹ آپ کے قدموں میں تھا مگر آپ نے نہ اس پر فخر کیا، اور نہ ان کروڑ پتیوں کی طرف توجہ فرمائی غریب اور نادار لوگوں میں سے رضا کار بھرتی کئے اور انہیں کی اصلاح و تربیت کی طرف زیادہ متوجہ رہے پھر ایک وقت ایسا بھی آیا کہ سارا چنیوٹ آپ کا مخالف تھا اور چنیوٹ کے سیٹھ یہ کہتے سنے گئے کہ چنیوٹ دوسرے شہروں کی طرح نہیں یہاں شاہ جی کی تقریر ہرگز نہ ہونے دی جائے گی۔ مگر آپ ان اطلاعات کے باوجود وقت مقررہ پر وہاں تشریف لائے رات کو تقریر کا اعلان ہوگیا تھا۔ راقم الحروف ملازمت کی مجبوریوں کی بناء پر ان کی خدمت میں حاضر نہ ہوسکا۔ اور سارا چنیوٹ تہیہ کرچکا تھا کہ آپ کی تقریر نہ ہونے دی جائے گی۔ آپ جب وقت مقررہ پر جلسہ گاہ میں تشریف لائے اور خطبہ مسنونہ کے بعد بولنا شروع کیا تو ہر طرف سے اعتراضات کی بوچھاڑ ہوگئی آپ نے ایک بہادر مجاہد کی طرح ان اعتراضات کے جواب دیئے۔ اور فرداً فرداً ہر معترض کو خاموش کردیا۔ اور پھر وہ زوردار تقریر فرمائی کہ تقریر کے اختتام پر سب لوگوں سے اپنی ہمنوائی منوالی اثنائے تقریر میں آپ کی عقابی نظر نے مجھے کہیں کونے میں دبکا ہوا دیکھ لیا تو فرمایا کہ مجھے کون سے سرخاب کے پر لگے ہوئے ہیں یہ صرف خواجۂ دوجہاں ﷺ کی غلامی کا امتیاز ہے کہ آپ لوگ میری باتیں سن رہے ہیں اور میں سنا رہا ہوں۔ ورنہ میں کیا اور میری حیثیت کیا میں بھی مولوی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

فاضل پاس کر کے آنچ کسی سکول میں ملازم ہوتا اور بچوں کے ساتھ سر کھپانے میں مشغول ہوتا اور پھر انتہائی سوز و گداز کی لے میں یہ شعر ارشاد فرمایا

ماؤ مجنوں ہم سفر بودیم در دیوان عشق
او بصحرا رفت و ما در کوچہ ہا رسوا شدیم

اس دن کے بعد جب بھی راقم الحروف ان کی خدمت میں حاضر ہوا تو یہ واقعہ یاد آ کر راقم کی ندامت و احساس کمتری میں ازدیاد کا باعث بنتا رہا۔

چک جھمرے میں ایک بار تقریر میں فرمایا کہ میری عمر کا زیادہ حصہ یا ریل میں گذرا ہے یا جیل میں، راقم الحروف بھی تقریر میں موجود تھا راقم کو وہ مشہور رباعی یاد آ گئی۔

صبح دم کام سے گزرتی ہے
شب دلارام سے گزرتی ہے
عاقبت کی خبر خدا جانے
اب تو آرام سے گزرتی ہے

راقم نے یہ رباعی شاہ جی کے حسب حال بنا کر تقریر کے بعد انہیں سنائی

صبح دم ریل میں گزرتی ہے
شب کسی جیل میں گزرتی ہے
عاقبت کی خبر خدا جانے
اب تو اس کھیل میں گزرتی ہے

شاہ جی نے اسے بہت پسند فرمایا اور کہا میرے بھائی آپ نے ایک رباعی کو مسلمان کر دیا۔ کشمیر کے اللہ رکھا ساغر صاحب ساتھ تھے اس زمانے میں وہ شاید "آزاد" میں کام کرتے تھے انہوں نے اس رباعی سے ایک اشاعت کے فکاہات کا کام چلایا اور راقم الحروف کی غیر شاعرانہ شکل و شباہت پر یہ فقرہ چست کیا کہ فلاں بظاہر تو آلوؤں کے بیوپاری معلوم ہوتے ہیں مگر بباطن ایک خوشگوار شاعر ہیں اس کے بعد راقم نے ہمیشہ آلوؤں کے بیوپاریوں کو غور سے دیکھا مگر شکل و شباہت سے انہیں کچھ بھی مشابہ نہ پایا ممکن ہے کہ کشمیر کے بیوپاری میرے ایسے ہوتے ہوں مگر اس کے بعد نہ اپنا کشمیر جانے کا اتفاق ہوا اور نہ ساغر صاحب سے پھر ملاقات ہو سکی۔ ایک بار شاہ جی تقریر فرما رہے تھے اور بجلی کی روشنی میں ان کا چہرہ اور ماتھا پُر جلال طریقہ پر آفتاب کی طرح چمک رہے تھے راقم کو کسی پرانے استاد کی یہ رباعی یاد آ گئی۔

از سخن شہد ناب مے چکدش
وز تبسم گلاب مے چکدش
مے تواں گفت کز حرارت مے
از جبیں آفتاب مے چکدش

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

راقم الحروف نے اس رباعی کو یوں حسب حال بنایا ہے۔

از سخن شہد ناب مے چکدش
و ز تکلم گلاب مے چکدش
مے توان گفت کز حرارت وعظ
از جبیں آفتاب مے چکدش

تقریر کے بعد یہ رباعی شاہ جی کو سنائی انہوں نے اپنی تعریف اور تغیر الفاظ کو توٹال دیا اور یہ ان کی ادائے خاص تھی کہ اپنی تعریف کو کچھ زیادہ پسندیدگی کی نگاہ سے نہیں دیکھتے تھے۔ اور نہ دوسرے لیڈروں کی طرح جلسے جلوس اور اخبارات میں چھپنے کا اہتمام کرتے البتہ اصل رباعی کو انہوں نے پسند فرمایا اور بار بار مجھ سے سنا پھر بار بار خود پڑھا اور اپنی نوٹ بک میں اسے نوٹ کرلیا۔ اور یہ رباعی دماغ پر ایسی چھائی کہ آخرکار ایک طویل بہار یہ نعت ان سے لکھوائی آپ کی نعت گویا اسی رباعی کا جواب ہے۔ جس کا مطلع ہے

ہزار صبح بہار از نگاہ می چکدش
جنوں زسایۂ زلف سیاہ می چکدش

(یہ مکمل نعت آپ کے مجموعہ کلام "سواطع الالہام" میں چھپ چکی ہے)

ڈیرہ غازیخان میں حضرت شاہ جی تشریف لایا کرتے تھے تو عموماً ان کی تقریریں رد بدعات پر ہوا کرتی تھیں اور ابتدائی زمانہ میں جب ابھی انہوں نے خواجہ غلام فرید رحمۃ اللہ تعالی کے کلام کا پورا مطالعہ نہیں کیا تھا بعض تقریروں میں خواجہ صاحب کے غالی مریدوں کے بعض غلو آمیز مدحیہ اشعار کی تردید فرمائی اور اس طرح گویا پیروں فقیروں کی دنیا سے ان کا ایک محاذ بن گیا۔ بعد میں جب بہاولپور سے حضرت خواجہ کا اردو ترجمہ والا دیوان طبع ہو کر آیا اور حضرت نے راقم الحروف کا لکھا ہوا بسیط مقدمہ اور دیوان دونوں ملاحظہ فرمائے۔ تو ایک ملاقات میں راقم سے فرمایا کہ تم نے خواجہ صاحب کے مزار پر جو گرد و غبار پڑا ہوا تھا دھو دیا اللہ تعالی تمہیں جزائے خیر دے اور اسی کے نتیجہ میں آپ نے خواجہ صاحب پر اپنی مشہور فارسی نظم لکھی جس کا مطلع ہے

گلشن عشق چشتیاں بہ طپید
شعلۂ اش خواجہ غلام فرید

ہاں تو یہ اس زمانے کی بات ہے جب آپ خواجہ صاحب کے مخالف سمجھے جاتے تھے اور خواجہ صاحب کے معتقد آپ کے خلاف جلسے کیا کرتے تھے، ڈیرہ غازیخان کے ایک ایسے ہی سٹیج پر جو آپ کی مخالفت میں مشہور تھا ایک بار ایک جلسہ ہوا جس کی صدارت ہمارے ضلع کے مشہور پیر حضرت خواجہ نظام الدین تونسوی صاحب نے فرمائی ایک دوست کی فرمائش پر راقم نے ایک نظم لکھی جو خواجہ صاحب کی تعریف میں تھی اور جلسہ کی ابتداء میں ایک خوش الحان آدمی نے اسے پڑھ کر سنادیا نظم کا مطلع کچھ اس طرح تھا

یہ ہے والطور کی دنیا یہ ہے والتین کی دنیا
الگ ہے ساری دنیا سے نظام الدین کی دنیا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

یار لوگوں نے نظم نوٹ کر لی اور شاہ جی تشریف لائے تو انہیں سنا ڈالی شاہ جی کی نقاد انہ نگاہ سے یہ چھپا نہ رہ سکا کہ یہ نظم کس کی کہی ہوئی ہے شاید لوگوں نے بھی میرا نام لے دیا ہو بہر حال انہیں اس پر بہت طیش آیا اور اس طیش کی حالت میں انہوں نے فی البدیہ بہت سے اشعار کہہ ڈالے جن کا کچھ حصہ آپ کے کلام میں طبع ہو چکا ہے اور جس کا مطلع ہے

نہ یہ والتین کی دنیا نہ والزیتون کی دنیا
نہ یہ مفروض کی دنیا نہ یہ مسنون کی دنیا

اور راقم الحروف سے جب ملاقات ہوئی تو یہ ساری نظم سنا ڈالی مگر واہ رے وضعداری یہ نہیں فرمایا کہ یہ نظم "جواب آں غزل" ہے راقم نے بھی انتہائی اطمینان سے ساری نظم سنی اور پوری پوری داد دی مگر عمر بھر ان کے سامنے یہ کہنے کی جرأت نہیں ہوئی کہ وہ نظم میں نے لکھی تھی اور نہ شاہ صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ رحمتہ واسعتہ نے کبھی مجھے اس سلسلہ میں شرمندہ فرمایا گویا اسے آپ "مقطع کی سخن گسترانہ" بات ہی خیال فرماتے تھے اور مقطع کی سخن گسترانہ بات نہ سمجھتے تو اس کے بعد خواجہ نظام الدین صاحب سے ملاقاتیں ہی نہ ہوتیں جب خواجہ صاحب نے آپ کے مبلغین سے تعاون شروع کر دیا اور اصلاحی معاملات میں ان کی مدد فرماتے رہے تو جہاں تک میری معلومات کا تعلق ہے شاہ جی قبلہ نے ان کی تعریف فرمائی اور ملاقات بھی فرمائی بلکہ تونسہ شریف کو تو وہ اپنا پیر خانہ سمجھتے تھے کیونکہ آپ کی ابتدائی بیعت حضرت پیر مہر علی شاہ صاحب گولڑوی سے تھی اور وہ خانوادۂ سیال شریف کے مرید تھے اور سیال شریف والے حضرات تونسہ شریف والوں کے مرید تھے مگر تبلیغ کے سلسلہ میں شاہ جی ایسے شمشیر براں تھے اور حق گوئی میں اتنے بے باک کہ حق کے معاملے میں جس طرح وہ کسی دنیاوی آدمی سے مرعوب نہیں ہوتے تھے اسی طرح وہ کسی دینی شخصیت سے بھی مرعوب نہیں ہوتے تھے۔

کسرِ نفسی

حضرت شاہ جی نے سب کچھ ہوتے ہوئے اپنے آپ کو کبھی کچھ نہ سمجھا اور تواضع و انکسار کا یہ عالم تھا کہ ہر اس آدمی کو جس کے متعلق یہ کہہ دیا جاتا تھا کہ یہ حضرت علامہ سید انور شاہ کشمیری قدس سرہ کا تلمیذ ہے اپنا استاد تصور فرماتے تھے اور پھر اس کے ساتھ انتہائی انکسار سے پیش آتے راقم الحروف کی استادی بھی جس کا ڈھنڈورا شاہ جی رحمہ اللہ کے فرزند بلند اقبال سید ابوذر بخاری اطال اللہ بقاءہ نے شاہ جی کے کلام سواطع الالہام کے تعارف میں پیٹا ہے کچھ اسی طرح شروع ہوئی جب انہیں بتلایا گیا کہ میں حضرت شیخ الاسلام کشمیری کا شاگرد ہوں تو انہوں نے بڑھ کر مجھے سینہ سے لگایا اور فرمایا پھر یہ تو ہمارے استاد ہوئے۔ گویا جیسے بربنائے ادب استاد، استاد زادے کو استاد کہہ دیا جاتا ہے اسی طرح حضرت علامہ کشمیری کی روحانی اولاد کو بھی (خواہ وہ میرے ایسے بدنام کنندہ نکونامے چند ہی کیوں نہ ہوں) اپنا استاد مانا اور اس کے بعد شعر و سخن کے ادوار میں کبھی ایک آدھ مشورہ اس طرح دے دیا جیسے کہ

گاہ باشد کہ کودک ناداں
بغلط بر ہدف زند تیرے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

تو آپ نے حوصلہ افزائی فرمائی اور اس مشورے کو قبول فرمالیا اور ساتھ ہی ہر آوند و داوند کو جب وہ نظم سناتے ہیں تو یہ ارشاد ہوتا ہے کہ میں نے یوں لکھا تھا اور فلاں نے اس میں یوں اصلاح کی ہے اور یہ اصلاح مجھے بہت پسند ہے اور کیوں نہ ہو میاں آخر حضرت علامہ کشمیری کے شاگرد ہیں وغیرہ وغیرہ اور شرمندگی کا یہ عالم ہوتا تھا کہ سر ندامت اٹھائے نہیں اٹھتا تھا ایک آدھ بار میرے سامنے بھی جب یہ معاملہ ہوا تو میں نے عرض کیا کہ قبلہ شرمندہ نہ فرمائیے میری استادی صائب کے استاد کی استادی جیسی ہے فرمایا وہ کیسے؟ میں نے عرض کیا کہ صائب نے اپنے استاد کے متعلق لکھا ہے

از ادب صائب خموشم ورنہ در ہر وادئے
رتبہ شاگردئ من نیست استاد مرا

شعر چونکہ بہت شوخ و شنگ تھا اس لئے اسے بہت پسند فرمایا اور کہا کہ نہیں بھائی ابلیس تمہارا استاد ہوتا تو یہ شعر صحیح ہوسکتا تھا بہر حال یہ محض ان کی ادب نوازی اور خورد نوازی ہی تھی کہ وہ ہر آنے جانے والے سے یہی فرماتے تھے کہ میں فلاں سے اصلاح سخن کے سلسلہ میں مشورہ لیتا ہوں۔ ورنہ نہ ان کو مشورہ کی ضرورت تھی اور نہ کبھی باقاعدہ یہ مشورہ بازی ہوئی اور جہاں تک میرا خیال ہے سالک مرحوم سے بھی ان کا یہی سلسلہ تھا یعنی کبھی برسبیل تذکرہ گرمیٔ مجلس میں انہوں نے کوئی بات کہدی ہو اور انہوں نے گرہ میں باندھ لی تو ممکن ہے کہ لیکن باقاعدہ اصلاح سخن کی نہ شاہ جی رحمہ اللہ تعالیٰ کو ضرورت تھی اور نہ اس قدر وہ اپنے کلام کو اہمیت دیتے تھے اور نہ اتنا لکھنے لکھانے میں کچھ انہماک تھا وہاں تو یہ عالم تھا کہ کبھی کبھار کچھ زبان پر آگیا اسے دو چار دن تک یاد رکھا اور آنے جانے والوں سے اس کا تذکرہ بھی فرمایا اور اس کے بعد ایسا بھلایا کہ پھر کبھی زبان پر نہ لائے۔ یہ جتنا بھی کلام جمع ہوا ہے یہ بھی ان کے بیٹے سید ابوذر بخاری نے مختلف مجالس میں مختلف چیزیں سن کر نوٹ کر لیں اور یوں مدتوں کے بعد یہ چھوٹا سا مجموعہ تیار ہوا بہر حال شاہ جی کی غریب نوازی (یاد رہے کہ ان کے پہلے استاد غریب امرتسری تھے) اور سالک نوازی میں تو ممکن ہے کچھ اصلیت بھی ہو مگر راقم کے معاملہ میں محض ان کی ذرہ نوازی ہی تھی ورنہ میں عمر کے لحاظ سے ان کا استاد ہوسکتا ہوں اور نہ علم کے لحاظ سے سخن فہمی کے سلسلہ میں اپنے آپ کو ان کا ایک ادنیٰ شاگرد اگر ثابت کر سکوں تو یہ میری انتہائی خوش بختی ہوگی ورنہ حقیقت یہ ہے کہ وہ اتنے اونچے تھے کہ ہمارے ایسے لوگ ان کی شاگردی کے قابل بھی نہیں تا بہ استادی چہ رسد، یوں ان کی نوازش کی انتہا یہ تھی کہ خواب میں بھی الہامی شعر کہتے تو اٹھتے ہی صلاح کے لئے پیش کر دیا کرتے تھے۔ اس سلسلہ میں "سواطع الہام کا اکیسواں ساطعہ ہی نقل کر دینا کفایت کرے گا۔

حظہ فرمائیے

وحدت بوجد و حالت کثرت در آمدہ
حرکت بجلوہ، جلوہ بحرکت در آمدہ

موسیٰ و طور و وادیٔ ایمن، حرا، حرم
ہرجا کہ دیدہ ایست بحیرت در آمدہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اس کے متعلق خود فرمایا انتخاب کے بعد وزارتی مشن کی آمد سے کچھ پہلے دہلی جانا ہوا ایک روز عبد الستار سالار دہلی کے ہاں سویا ہوا تھا تو دیکھا خواب میں یہ شعر بلند آواز سے پڑھ رہا ہوں اتنے میں قاضی احسان احمد نے آ کر جھنجھوڑا اور زور زور سے شاہ جی شاہ جی کہہ کر جگا دیا گھبرا کر اٹھتے ہی میں نے کہا: ارے ظالم مار ڈالا شعر ہو رہے تھے یہ تو نے کیا کیا؟ مولانا طالوت جو ان دنوں کسی کام سے دہلی گئے ہوئے تھے اور میرے ہی مکان میں ٹھہرے ہوئے تھے ان سے باتیں کرتے کرتے سو گیا تھا میں نے فوراً انہیں مخاطب کیا اور غنودگی کی حالت میں ہی ان کے زانو پر ہاتھ رکھ کر کہا ذرا دیکھئے تو مولانا یہ شعر ٹھیک ہیں نا؟ اور یہ شعر پڑھ کر سنائے تو وہ کہنے لگے جی ہاں! بالکل ٹھیک ہیں میں نے کہا مولانا ابھی میں خواب میں یہ شعر پڑھ رہا تھا اگر قاضی نہ جگاتا تو پوری نظم ہو جاتی۔

شاہ جی رحمہ اللہ تعالیٰ ایسے زندگی سے بھرپور انسان تھے کہ اب تک ہمارے بھائی مظہر نواز خان کو ان کی موت ہی کا یقین نہیں آتا اور یقین کیسے آئے جب تصور میں اب بھی ان کی گرمیٔ مجلس کی صدائیں کانوں تک پہنچ جاتی ہیں اللہ تعالیٰ کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے ظفر علی خان کیا خوب فرما گئے ہیں

کانوں میں گونجتے ہیں بخاری کے زمزمے
بلبل چہک رہا ہے ریاضِ رسول میں

اگر کسی زندہ و بیدار قوم میں ایسا باکمال و مخلص پیدا ہوتا تو وہ قوم بامِ عروج پر پہنچ جاتی اور شاید دوسرے ملکوں میں انقلاب کا ذریعہ ہوتی۔

سید ابوالحسن علی ندوی: (لکھنؤ)

اسلام اور مسلمانوں کے سچے وفادار تھے۔ **مولانا محمد منظور نعمانی**

وہ برطانوی سامراج کے اولیٰ مخالف مجاہد تھے۔ اُن کی بے پناہ قربانیاں ناقابلِ فراموش ہیں۔

شاہ جی اس دور کے علماء و زعماء میں سے ایک تھے جنھوں نے مولانا محمد علی جوہر مولانا شوکت علی، مولانا عبدالباری، اور عبدالماجد بدایونی کے ہمراہ برطانوی سامراج کے خلاف جہاد عظیم میں نمایاں حصہ لیا تھا ان کی تقاریر سحر آفرین تھیں۔

مولانا عبدالحامد بدایونیؒ:

اُن کی ہنس مکھ صورت آنکھوں میں پھر رہی ہے۔ اللہ اللہ!! کیا دم خم تھا، کیا عزم و ولولہ تھا، اور کیا غیر مرعوب شخصیت تھی۔ وہ پیار و محبت، ایثار و غیرت و حمیّتِ اسلامی کے مجسمہ تھے۔

علامہ محمود احمد عباسیؒ:

خطابت ان کا فن نہیں فطرت تھی **علامہ دوست محمد قریشیؒ**

© rasailojaraid.com